ہو سکتے ہیں اور نہ ہیں، دراصل ان میں سے بہت سے بلکہ اکثر خیالات بعض دوسرے مذاہب میں بھی موجود ہیں لیکن مسلمانوں کے مذہبی فکر نے ان خیالات کو مجتمع یا ان کو کسی خاص شکل میں متشکل کر کے ایک امتیاز حاصل کیا ہے اس مضمون میں ان مختصر تاریخی تمہیدوں اور اشاروں کے علاوہ جو ناگزیر ہیں کسی تاریخی یا اعتقادی تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔

تشکل سے یہاں مراد صرف الٰہیات کی وہ اصطلاحی تعریفیں نہیں ہیں جن پر کسی بندھے ٹکے نظامِ حیات کا مدار ہوتا ہے، یہ بہت اہم اور ضروری چیز ہے کہ ابتدا ہی سے مذہبی احساسات و وجدان (   ) کے زبانی اظہار اور اس کی منطقی اور فلسفیانہ تنظیم کے درمیان ایک واضح لکیر کھینچ دی جائے، اگرچہ یہ ہو سکتا ہے کہ آخر الذکر (یعنی منطقی اور فلسفیانہ تنظیم) ایک دفعہ حاصل ہو جانے کے بعد مذہبی تجربے میں داخل ہونے والے افکار پر اور اس کو ادا کرنے والے الفاظ پر اثر ڈالے اور اس کی سمتیں متعین کرے۔ قرآن کے سلسلے میں بھی اسی قسم کا امتیاز متعین کر لینا ضروری ہے۔ اس کے بیانات اور تعریفیں اگرچہ ایک طرح سے انفرادیت رکھنے والے مسلم خیالات اور اعتقادات کی اور ان کی منظم ترکیبوں کی بنیاد ہیں، لیکن الٰہیات کے نقطۂ نظر سے یہ بیانات خود اپنے اندر کوئی تنظیم نہیں رکھتے۔ بلکہ کسی نوری اسلوب عمل (ATTITUDE) یا الہامی طور پر حاصل کئے ہوئے خیالات کا براہِ راست لفظی اظہار ہیں، عام طور پر یہ اسالیب عمل اور بیانات ہی جن کو قرآن نے مستحکم کر دیا ہے اور مکمل اقتدارِ اعلیٰ کے خلعت سے سرفراز کیا ہے مسلمانوں کے مذہبی تصورات کو متعین کرتے اور معرضِ اظہار میں لاتے ہیں۔

مسلمانوں کے مذہبی تصورات کے ایسے ماخذ اور عوامل (DETERMINANTS) کو چار عنوانات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے (۱) قدیم نظریات و اعتقادات جو ملتِ اسلامیہ سے منسلک رہے۔
(۲) قرآنی تعلیمات و اثرات جن پر سنتِ نبوی کے اثرات کا اضافہ ہوا۔ (۳) اسلامی عقائد اور اخلاقیات کی وہ تنظیم جو متکلمین (DOGMATIE THEOLOGIANS) نے کی۔
(۴) تصوف کا نفوذ۔ اگرچہ ہمیشہ اور ہر جگہ ایک واضح لکیر کھینچنا ممکن نہیں، لیکن یہ تقسیم بحث اور تجزیہ کے مقصد کے لئے کارآمد ہو گی اور اس کا اطلاق مسلمانوں کے ہر ایک طبقے کے مذہبی اعمال پر

ہو سکتا ہے، ان میں سے ہر ایک ان چار قسموں کے بدلتے ہوئے اثرات کی بنا پر ایک دوسرے سے نظری نہیں تو عملی طور پر مختلف ہے۔

چونکہ اس قسم کی بحث لازمی طور پر کسی شخص کے اپنے فکری اکتسابات و اقدامات سے متاثر ہوتی ہے اس لیے ان مقالات میں وقتاً فوقتاً کچھ عام تبصرے بھی شامل کر دیئے گئے ہیں، ان خیالات کا اظہار حتمی طور پر کیا گیا ہے لیکن ان کو ایک قولِ فیصل نہیں بلکہ صرف مقدمات سے تعبیر کرنا چاہئے جس کے ذریعے پڑھنے والا مصنف کے نقطۂ نظر سے واقف ہو سکتا ہے اور اُس کی اُن رایوں پر تنقید کر سکتا ہے جن کو وہ ظاہر کر رہا ہے۔

ان مضامین میں لفظ اسلام سے اصلی و بنیادی طور پر مراد ہے زندگی کا ایک مذہبی تصور، مذہبی اور معاشرتی رواج میں چاہے کتنے ہی غیر اہم اثرات و عناصر کیوں نہ شامل ہو جائیں ان کا جوہر اصلی اور ان کے مختلف اور متفرق اجزاء کو ترکیب دینے والا عنصر اس دنیوی زندگی کی علت غائی کے ایک داخلی یا تہ نشین احساس سے عبارت ہے (خواہ اس کے اظہار کی صورت کچھ بھی ہو)

ہر وہ شخص جس نے اس قسم کی کوششیں کی ہیں اچھی طرح سمجھ سکتا ہے کہ ایسے لوگوں کے مذہبی نظریات کا ادراک کرنا کس قدر مشکل کام ہے جن کا نظریۂ کائنات ہمارے اپنے نظریہ سے بالکل جداگانہ اور کلی یا جزوی طور پر مختلف روایات کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہو۔ دورِ جدید کے مغربی ذہن کے لیے مسئلے کی یہ نوعیت بہت ہی مشکل ہے۔ جہاں کہیں مذہب ایک ٹھوس روحانی طاقت کی حیثیت میں موجود ہو وہاں وجدانی قوتوں کو کام میں لانے اور ذہن کو عقلی اور بلا واسطہ منطقی تجزیہ کے طریقوں سے ماوراء جست لگانے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ طبیعت اشیاء کے بعض ایسے پہلوؤں کو سمجھ سکے اور انہیں تجزیہ کی ٹھوس اور بھرپور دنیا میں تلاش کر سکے جن کو عقل کے ذریعہ سے پہچاننا اور بیان کرنا مشکل ہے، ایمان اُن چیزوں کا ماحصل ہے جن کی امید کی جاتی ہے لیکن اُن کو دیکھا نہیں جا سکتا۔ ایک ایسا شخص جس کو مغرب کی اٹھارھویں اور اُنیسویں صدی کی انگریزی عقلیت کے تصورات اور اقدار ورثہ میں ملی ہیں اور جس کا ذہن ان تصورات اور اقدار کے سانچے میں ڈھل چکا ہے یا جو پچھلی

ڈیڑھ صدی کے جرمن افکار و اقدار سے متاثر ہوا ہے اس کے اندر وجدانی قوت اس قدر مضمحل اور از کار رفتہ ہو جاتی ہے کہ اس کو ان چیزوں کے وجود کا اقرار کرنے میں زبردست تامل ہوتا ہے اور وہ یہ تصور نہیں کر سکتا کہ یہ قوت کس طرح عمل کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مذہب کے متعلق ہم مغربی افراد کا فیصلہ بہت زیادہ غیر متوازن ہو گیا ہے۔

اگرچہ مذہب کے لئے وجدان کی ضرورت مسلم ہے لیکن یہ قوت خود بھی بہت غیر متوازن رہتی ہے اگر اس کے مکاشفات کے جوہر کو اشیاء کے بارے میں عقلی ادراک کا سہارا نہ ملے، یہ تعلق کسی حد تک منفی ہوتا ہے کیونکہ عالم طبیعی کا عقلی شعور وجدان اور تخیل کو بے سر و پا توہمات کی طرف جانے سے روکتا ہے اور جب یہ شعور نشوونما پا کر ترقی کی منزلوں پر پہنچ جاتا ہے تو وہ وجدان کو بعض ایسی معمولی غلطیوں سے آزاد کر دیتا ہے جو اصول فطرت سے ناواقفیت کی بنا پر پیدا ہوتی ہیں (جیسے کہ علم نجوم کا یقین یا سورج اور چاند کا گرہن کی اہمیت کا تصور) اس کے جواب میں وجدان بھی ان معلومات کا نقص جتاتا رہتا ہے جن سے عقل کام لیتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مذہبی یا اخلاقی اور فلسفیانہ مقاصد کے درمیان ایک کشمکش رہتی ہے۔ مذہبی تخیل مستقل طور پر فلسفہ کے لئے نئے نئے مقاصد مہیا کرتا ہے۔ فلسفہ ان کی وضاحت کرتا ہے اور ان کو عقلی دنیا کے نظام میں پیوست کرتا ہے۔ اس قسم کی کوشش کے اندر الٰہیات کا جوہر اور اس کی تکمیل کا راز مضمر ہے اس لئے کہ اس علم کے اندر وجدانی بصیرتوں کے افق کو متعین کرنے کی کوشش کی جاتی ہے (یہاں تک کہ ایک قلیل مدت کے اندر ہی وجدان ایک مرتبہ پھر نئے تجربات کی تلاش میں رہ نورد ہو جاتا ہے)

جہاں تک بڑے مذاہب کا تعلق ہے وجدان اور عقل یا جذبات اور تفکر یا (بعض اہل شوق یہ پاسکل کے لفظوں میں) ذہن اور قلب کی یہ کشمکش ایک حد تک اس وجہ سے چھپی ہوئی سی رہتی ہے کہ یہ ان مذاہب کے اپنے قاعدوں کی پابند ہوتی ہے یا اس پر ظاہر پرستی کا رنگ غالب ہوتا ہے، یہ دونوں اجزاء جن کے باہمی ربط سے مذہبی زندگی اور کردار کی تشکیل ہوتی ہے مناسب راہوں پر چلائے جاتے ہیں اور علامتوں کے ایک خاص نظام کے تحت ان کا اظہار ہوتا ہے۔ فکر و عبادت کے ان کے مقررہ سانچے

ہوتے ہیں۔ وقت آنے پر یہ ایک ایسے مجموعۂ الٰہیات کو جنم دیتے ہیں جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان علامات اور طریقوں کی عقلی طور پر تشریح کرے اور ان کی اہمیت بتائے۔ لیکن عبادت کرنے والے کے اندر جو چیز جذبہ اور تصور کو حرکت دیتی ہے وہ یہ مجموعۂ الٰہیات نہیں بلکہ اس کے اندر بیان کئے ہوئے علامات اور سانچے ہوتے ہیں اور کوئی مذہب اس وقت تک زندہ نہیں رہ سکتا جب تک کہ اس کی استعمال کردہ علامتیں اس کی عملی ضرورتوں کے لئے کافی نہ ہوں ان ضرورتوں میں صرف اشخاص کے ایمان کو تحریک دینا یا ان کے ارادہ و عمل پر حکم چلانا ہی شامل نہیں بلکہ یہ بھی شامل ہے کہ مذہب ان کے ادراک کو اس مادی عالمِ محسوس کی حدود سے آگے لے جائے۔

لیکن کسی مذہبی فرقے میں علامات اور ان سے پیدا ہونے والے اثرات کا مفہوم اس کے افراد کی نظر میں یکساں نہیں ہوتا۔ درحقیقت اس سلسلے میں اس کے مختلف گروہوں بلکہ مختلف افراد میں بھی زبردست فرق پایا جاتا ہے جو فرقہ جتنا بڑا ہوگا اور جس قدر اس کے مختلف گروہ ایک دوسرے سے طریقہ ہائے زندگی، جغرافیائی حالات۔ کسبِ معاش۔ تہذیبی و تعلیمی معیار، تاریخی پس منظر اور معاشرتی روایات کے اعتبار سے مختلف ہوں گے اسی قدر وہ اپنے مذہبی علامات کو جذباتی، تخیلی اور عقلی طریقوں سے برتنے میں مختلف ہوں گے اور یہ اختلاف نسلاً بعد نسل قائم رہتا ہے خواہ اکابر اور رہنمایانِ مذہب ساری قوم کو متحد اور منظم کرنے کے لئے ان کے نظریات و تصورات و عمل کو متحدہ منزل پر لانے کی کتنی کوشش کیوں نہ کریں۔ عیسائی مذہب کے ہر ایک فرقہ میں اس اختلاف کی اتنی بہت سی مثالیں ملتی ہیں کہ ان کو یہاں پر بیان کرنا بھی مشکل ہے، غالباً کسی دوسری ملت میں مذہبی وجدان اور عقلی الٰہیات کا یہ اختلاف اتنا بنیادی اور نمایاں نہیں ہے جتنا کہ مذہبِ اسلام میں ہے اور یہاں یہ اپنے مدارج کے شدید ترین تفاوت کی شکل میں بھی دیکھا جا سکتا ہے، جادوگری سے متاثر جاہلی تاویلوں سے لے کر انتہائی عظیم الشان روحانی تصورات تک (جن کے اندر بقول رابرٹسن سمتھ ایسی عادات فکر کی جھلک ہے جو ذہنی اور اخلاقی ارتقاء کے بہت مختلف مدارج کا پتہ دیتی ہے) ہر ایک مقام پر اس تفاوت کے نمونے ملتے ہیں ان تاویلات کے درمیان جو کشمکش ہے وہ حقیقت میں صرف

مسلمانوں کے مذہبی ترقی کے تاریخی ڈرامہ کی تشکیل کرتی ہے بلکہ آج کل اسلام کی بہ حیثیت مذہب جو اندرونی حالت ہے اس کو بھی متعین کرتی ہے۔

اسلامی تاریخ کی یہ ایک اہم اور بنیادی حقیقت ہے کہ اس نے ایک مخصوص قسم کے جاہل (یعنی قدیم عرب کے) معاشرے میں جنم لیا۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اسلام اس معاشرے ہی کا ایک جزو بن کر نکلا یا وہ اس معاشرے کے ارتقاء کا ایک مظہر تھا۔ نہیں۔ اسلام کی حیثیت عرب جاہلیت کے خلاف ایک بغاوت کی سی تھی البتہ کسی حد تک اس کے اندر اس کے ماحول کا عکس پایا جانا ناگزیر ہے۔

عرب جاہلیت کے عام خد و خال بہت سی مشہور کتابوں میں بیان کیے جا چکے ہیں، جاہلیت کا ظہور کہیں بھی ہو اس کے کچھ امتیازی خصوصیات ہوتے ہیں اور یہ خصوصیات عرب جاہلیت میں بھی مشترک تھے، ان خصوصیات میں سے ایک یہ عقیدہ ہے کہ مافوق الفطرت ہستیوں کے اثر کا دائرہ بہت وسیع ہے چنانچہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ روزمرہ کی زندگی میں انسان ان سے مستقل طور پر دوچار ہوتا ہے اور پیہم ان کے اثرات و عمل کی زد میں رہتا ہے، اس وجہ سے طبیعی اشیاء و واقعات میں سے اکثر کو انتہائی خوف اور تعظیم کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اور ان کو انہیں مافوق الفطرت ہستیوں کی قوت کا مظہر یا محل سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ عرب ان ساحرانہ خواص پر یقین رکھتے تھے جو ان کے خیال میں پتھر کی مورتیوں میں یا مقدس پیڑوں اور کنوؤں میں جاگزیں تھے یا ان پر سایہ کیے ہوئے تھے یا بعض ایسے اشخاص کے قبضے میں تھے جن میں سے کچھ تو انسان (مثلاً ساحر، کاہن بلکہ شاعر بھی) ہوتے تھے، لیکن جن میں سے زیادہ غیر انسانی ہستیاں ہوتی تھیں۔ ان غیر انسانی ہستیوں کو جن کہا جاتا تھا۔ ان کی سحری قوتوں پر اعتقاد کے ماخذ انسانیات کے دانشوروں (Anthropologists) کے نزدیک متعدد ہیں، لیکن یہ بحث موجودہ موضوع سے غیر متعلق ہے۔ یہاں صرف یہ کہنا کافی ہوگا کہ جن کے عقیدہ کا تعلق اس چیز سے ہے جسے ولیو مارک نے ایسے عجیب اور پُراسرار حوادث کا نام دیا ہے جو کسی صاحبِ ارادہ بالخصوص انسانوں کے دل میں خوف کو جگہ دینے والے سبب کا پتہ دیتے ہیں۔

یہ سحر کار قوتیں جو ان تمام اشیا یا ہستیوں سے صادر ہوتی تھیں دو طرح کی ہو سکتی تھیں اگر یہ فائدہ مند

ہوتیں تو ان کے اثر کو برکت کہا جاتا یا پھر ضرر رساں ہوتی تھیں مثلاً نظرِ بد، سب سے ابتدائی اور ناپختہ شکل میں عربوں کے مذہب کو مختصراً اُن کوششوں سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جن کی مدد سے بُری ہستیوں کے ہر جگہ محسوس کئے جانے والے اثر کے خلاف، برکت کے قوی ترین وسیلوں کو تلاش اور استعمال کیا جا سکتا تھا۔ لیکن عرب میں ایسی رسوم کے وجود کا کوئی ثبوت نہیں ملتا جن کو افریقہ کے جھاڑ پھونک کرنے والے لوگوں کے کام سے تشبیہ دی جا سکے۔ (اگرچہ دوا دارو کے لئے عربی کا لفظ 'طب' شروع میں منتر جنتر کا مفہوم رکھتا تھا) عرب بُت پرستوں کی عبادت کا منتہا یہ تھا کہ مخصوص اوقات میں ان کے قبیلے ایک مقدس پتھر کی زیارت کو جاتے اور عبادت کرنے والوں کو ایک خاص لباس پہننے، سر منڈانے اور اسی قسم کے دُوسرے چند اصولوں کی پابندی کرنا پڑتی تھی اور کچھ ممنوعات کو ترک کرنا پڑتا تھا یہ ساری رسم عبادت گاہ کے گرد چکر لگانے پر، مقدس پتھر کے اوپر کسی جانور یا جانوروں کی قربانی اور اس قربانی کی دعوت پر ختم ہو جاتی تھی۔

اس دنیا میں جس کو مافوق الفطرت عناصر نے اس طرح گھیر رکھا تھا خدا کو بھی بہت قریب اور مانوس خیال کیا جاتا تھا پہلی نظر میں یہ قوت اس سنگین حقیقت پسندی سے ٹکراتی ہوئی معلوم ہوتی ہے جو عربوں کی زندگی کے طبعی حالات نے ان پر مسلّط کر دی تھی اور جس کا عکس ان کی شاعری میں نظر آتا ہے جیسا کہ ڈی، بی میکڈانلڈ نے کہا ہے۔ "عرب لوگ آسانی سے ایمان لانے والے لوگوں میں نہیں معلوم ہوتے بلکہ وہ اپنے آپ کو ایسا ظاہر کرتے ہیں گویا کہ وہ ذہنی اعتبار سے بھاری بھرکم ہیں اور مادیت کی طرف جھکنے والے تجسس تشکک اور تحقیقات سے کام لینے والے اپنے توہمات و روایات کا مضحکہ اڑانے والے اور مافوق الفطرت ہستیوں کا امتحان کرنے والے لوگ ہیں اور یہ سب چیزیں ان سے ایسی شوخی اور طفلانہ بے باکی کے ساتھ سرزد ہوتی ہیں کہ دیکھنے والے کو تعجب ہونے لگتا ہے لیکن یہ تضاد صرف ظاہری ہے توہمات اور تشکیک ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں، موجودہ زمانہ میں بے شمار مثالیں اس کلیہ کی وضاحت کے لئے مل سکتی ہیں۔

عربوں کی یہ تشکیک بھی ایک حد کے اندر تھی یہ عام نہیں بلکہ جزوی چیزوں سے متعلق تھی، عرب

اس بات کے متعلق شک یا سوال کر سکتے تھے کہ کسی ایک خاص کاہن کا علم محض ڈھونگ ہے یا نہیں، یا وہ بعض مخصوص نواہی کے توڑنے کا خطرہ مول لے سکتے تھے لیکن وہ کبھی اس بات پر شک نہیں کر سکتے تھے کہ اس ظاہری دنیا کے پیچھے ایک اَن دیکھی دنیا بھی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ حضرت محمدؐ کی تبلیغ کی کامیابی کی بہت بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کے سامعین میں سے اکثر کے عقلی ادراک کی سطح اس نقطہ پر آگئی تھی جہاں پرانی علامات در سومات بے قدر و بے معنی ہو گئی تھیں اور ان کی اس خواہش کی تسکین نہیں کر سکتی تھیں کہ وہ عالمِ محسوس کے ماوراء جو چیزیں ہیں ان کو سمجھ سکیں۔

قرآن نے جو نئے راستے عربوں کی جذباتی و تخیلی صلاحیتوں پر کھول دیئے اور مسلمانوں کے مذہبی طرزِ عمل پر اس نے جو اثر ڈالا اس سے اگلے مضمون میں بحث کی جائے گی، سرِ دست ہماری توجہ صرف عرب بت پرستوں کے عام طبقے کی طرف ہے جس نے قرآن کے اصولوں کو مان تو لیا تھا مگر اپنے پرانے عقائد کو چھوڑے بغیر حضرت محمدؐ نے ان کے لئے جو کچھ کیا وہ یہ تھا کہ انھوں نے جاہلیت کے طریقہ پر چلنے والوں کو ایک قادرِ مطلق کی شخصیت اور کارسازی کی تعلیم دے کر جاہلیت کی اساس پر ایک عظیم الشان اور قہار طاقت کا تصور تعمیر کر دیا۔ لیکن اس اعلیٰ کارساز ہستی کے اعتقاد کی تہ میں عربی روایت بھی قائم رہی، سحر پرستی، جنوں کی مافوق البشر اور مہیب قوتوں پر ایمان اور ہر انسان کے ساتھ لگی ہوئی غیر محسوس ہستیوں کے قرینے کا یقین — یہ اور کتنے ہی ایسے خیالات تھوڑی بہت اسلامی آب و رنگ کے اضافہ کے ساتھ اپنی جگہ پر قائم رہے۔ یہ باقی ماندہ اثرات کائنات سے متعلق مسلمانوں کے (بالخصوص بے پڑھے لکھے عوام کے) خیالات پر زبردست اثر ڈالتے رہے اس تمام مسئلہ کو ڈی۔ بی میکڈانلڈ نے اپنے خطبات "اسلامی دنیا میں مذہبی زندگی اور معاملات" میں بصیرت افروز طریقہ سے بیان کیا ہے۔

لیکن جب عرب اور اسلام عرب سے باہر آئے اور مغربی ایشیا و ایران میں پھیل گئے تو کسی کو یہ گمان ہو سکتا ہے کہ عربی جاہلیت کا اثر اس وجہ سے کم ہو گیا ہو گا کہ عرب لوگ قدیم تہذیب کے لوگوں زردشتی، عیسائیوں اور یونانی عقائد کے پیروؤں کے ساتھ ربط قائم کر رہے تھے یا ان سے ٹکرا رہے تھے۔

یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر ابھی بہت زیادہ مطالعہ نہیں کیا گیا ہے اور اس سلسلے میں جو رائے ظاہر کی جائے گی یا نتیجہ نکالا جائے گا اس کی حیثیت ذاتی تاثر سے زیادہ نہیں ہوگی، بعض امور بالکل واضح ہیں، جن لوگوں کا ابھی نام لیا گیا ان میں باضابطہ مذہب اور مذہبی رسوم کے باوجود اب بھی ایک بہت بڑا سرمایہ قدیم رسوم وعادات اور مقبولِ عوام اعتقادات کا تھا جس کی اصل جاہلیت تھی، جہاں کہیں یہ عقائد وعادات اسلامی یا عربی تصورات کے مجموعہ سے تضاد رکھتے تھے (مثلاً زراعت پیشہ طبقہ کے وہ مذہبی رسوم جن میں زرعی نشو ونما کی دعا مانگی جاتی تھی) وہاں مسلمانوں اور عرب لوگوں کے باہمی اثر نے ان کو کم سے کم اسلام میں داخل ہو جانے والے مقامی لوگوں کی زندگی سے نکال باہر کر دیا۔ لیکن جہاں کہیں (مثلاً علم نجوم کے باب میں) یہ عرب جاہلیت کے ساتھ بہ آسانی ہم آہنگ ہو سکتے تھے وہاں خیالات کے یہ دونوں دھارے مل گئے اور ایک دوسرے کو تقویت پہنچانے لگے۔

عرب مسلمانوں کی فتوحات کے بعد تقریباً تین صدی کا عرصہ ایسا گذرا جس میں اسلام کی مقامی حدود جو کافی وسیع ہو چکی تھیں ایک جگہ پر رُک کر رہ گئیں اور ان میں کوئی اضافہ نہیں ہوا اسی طرح سے باہر سے آنے والے عربوں کو اور مقامی باشندوں کو (جن کے باہمی اختلاط سے قرونِ وسطیٰ کی مسلم قوم وجود میں آئی تھی) یہ موقعہ ملا کر ان کے مذہبی رسم وعادات آپس میں گھُل مل جائیں۔ ان کے صدیوں کے دوران میں مذہبی مناقشوں کا ایک طویل دور گذرنے کے بعد ایک خاص قسم کا توازن پیدا ہو گیا۔ اضافۂ عقل اور منطقی عبارات کی مدد سے اسلامی الہیات کی تاسیس ہوئی اس نئی کامیابی نے پوچ قسم کے توہمات کے اثر کو بڑی حد تک روک دیا۔ لیکن اسی کے ساتھ الہیات کے اس نظام نے جذباتی پہلو کے مقابلہ میں عقلیت کو زیادہ فروغ دیا۔ وہ لوگ جو علماء الہیات کی عقلیت کے خلاف تھے انھوں نے ایک الگ راہ اختیار کی۔ ان کی یہ کوشش تھی کہ اشیاء کے اندر عالم غیب کے اور الوہیت کے اثرات کی جو آمیزش ہے اس کے وجدانی احساس پر زور دیں اور اس کی ترویج کریں۔ ابتدا میں صوفیانہ برادریاں اور مذہبی طریقے قرآن کی قائم کی ہوئی جہات کے اندر محصور رہے اور معیاری اسلامی عقائد کے قائل رہے لیکن وہ عالمِ غیب کی قربت پر اور اس کے ہر طرف چھائے ہوئے ہونے پر جتنا زیادہ زور دینے لگے اتنا ہی

وہ قرآن وحدیث کے علاوہ دوسرے مآخذ سے بھی متاثر ہونے لگے جن میں جاہلیت کے عقائد و رسوم شامل تھیں۔ گیارھویں و بارھویں صدی کے آتے آتے لفظ تصوف کے اندر بہت سے مذہبی مسالک شامل ہو چکے تھے جن میں ایک طرف ایک ایسی اعلیٰ روحانی استقامت ملتی تھی جس کو کسی مذہب کے بلند ترین کمالات کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکتا تھا تو دوسری طرف اس میں ایسی بہت سی چیزیں بھی تھیں جو شعبدہ بازی سے زیادہ مختلف نہ تھیں اور جنھوں نے صرف ظاہری طور پر اسلامی لباس پہن لیا تھا،

اِس حد تک پہنچ جانے کے بعد یہ ہوا کہ وسطی ایشیا، ہندوستان، انڈونیشیا اور افریقہ میں اشاعتِ اسلام کی دوسری لہر نمودار ہوئی جس نے اسلام کے حلقہ میں ایسے لوگوں کو داخل کیا جو مغربی ایشیا اور مصر کے لوگوں کی تہذیب سے بالکل مختلف تہذیبی و مذہبی پس منظر رکھتے تھے۔ ان میں یا تو سیاہ رنگ والے لوگ اور تُرک تھے جن کے سابق مذاہب بالکل جاہلانہ تھے یا پھر ہندوستان سماترا اور جاوا کے لوگ تھے جن کا مذہب جاہلیت کے ساتھ ساتھ ہندو مذہب سے بھی متاثر تھا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان عوام میں جو جاہلی عناصر تہ نشین ہو کر رہ گئے تھے ان کو کافی تقویت پہنچی مثال کے طور پر یہ ظاہر ہے کہ مغربی افریقہ کے سیاہ فام قوموں کے رائج مشرکانہ رسوم و عبادات کا استیصال آسانی کے ساتھ نہ کیا جا سکتا تھا اور نہ کیا گیا جس طرح امریکہ کی پرانی اور اچھی طرح سے جمی ہوئی سیاہ فام اقوام سے ان عادتوں کو مکمل طور پر نہیں چھڑایا جا سکا اور چونکہ تبلیغ کا زیادہ تر کام مستند مذہبی رہنماؤں نے نہیں بلکہ صوفی حضرات نے انجام دیا تھا اس لئے اکثر مواقع پر پرانے جاہلی خیالات سے ایک طرح کا سمجھوتہ کر لیا جو اِن نومسلموں کی زندگی پر اب بھی حاوی تھے۔

لیکن آخر میں جو صورتِ حال پیدا ہو گئی وہ اس معاملے سے بھی بہت زیادہ پیچیدہ تھی اس کا اندازہ بعد کے ایک مضمون میں سلسلہ ہائے تصوف کے معاملات سے بحث کے دوران میں ہو سکے گا۔ یہ فرض کرنا سراسر غلط ہو گا کہ اسلام نے پرانے جاہلی خیالات کے لئے صرف ایک بساط کا کام دیا ممکن ہے کہ یہ بات اسلامی سوسائٹی کے بالکل نچلے عناصر کے بارے میں بڑی حد تک ٹھیک ہو اور اس سوسائٹی کے دُور افتادہ حصوں سے اس بیان کی تصدیق کے لئے مثالیں اب بھی لائی جا سکتی ہیں لیکن اسکے

ساتھ ساتھ اسلامی سوسائٹی کے اوپری طبقات کی طرف جاتے ہوئے ہم بتدریج ایسی مثالوں کا بھی ایک سلسلہ پائیں گے جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ اسلامی عقائد اور تعلیمات کا نفوذ اس سوسائٹی کے اندر کس قدر دُور رس اور موثر تھا۔

اس موقع پر یہ بہت ضروری ہے کہ جاہلی عقائد اور جاہلی نشانات کے درمیان تفریق کی جائے۔ تمام زندہ مذاہب کچھ ایسے نشانات کو محفوظ رکھتے ہیں (اور شاید محفوظ رکھنے پر مجبور رہیں) جو ابتداءمیں جاہلی رسومات اور عقائد سے تعلق رکھتے تھے، مذہب کی نشو ونما کے دوران میں بڑے مذہبی رہنما اس بات پر دھیان رکھتے ہیں کہ ایسے نشانات کا نظام برباد نہ ہو جائے کیونکہ یہ نظم ہی تخیل کے ان پیچیدہ سرچشموں کو تحریک پہنچاتا ہے جن سے مذہب کی وجدانی بصیرتیں حاصل ہوتی ہیں لیکن وہ ان علامات کو ایک نئی توجیہ کے ساتھ پیش کرتے ہیں جو ان کے روحانی اور عقلی مفہوم کو یکسر بدل دیتی ہے اور ان کو ان کی جاہلی اصل واساس سے اٹھاکر رفعت دیدیتی ہے اس کارآمد تفریق کے ذریعہ سے ان لوگوں کو ممیز کرتا ہے جن کے نزدیک ایک خاص جاہلی علامت اپنے جاہلی معنوں کے ہی ساتھ سامنے آتی ہے۔ اور وہ لوگ جن کے نزدیک اس علامت کے لئے ایک نئے اور اعلیٰ معنی ہوتے ہیں یہ فرض کرنا بہت ہی نازیبا قسم کی مادہ پرستی ہے کہ ہر جاہلی علامت لازمی طور پر ہمیشہ اپنے اصلی وابتدائی معنی کی حامل ہوتی ہے، اسلامی زندگی میں حجرِ اسود کے لئے عزت کا جذبہ جو ابتداء میں ایک جاہلی شعار تھا اس کو جناب محمد صلعم نے خدائے واحد ویکتا کی عبادت کی رسوم میں شامل کردیا۔ ٹھیک اس طرح جیسے کہ عیسائی عشاء ربانی نے "معبد" کی قربانی کی رسوم کو اور مشرکانہ عبادات میں شامل ہونے والی ضیافتوں کو اپنے اندر ضم کردیا۔

تاہم یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ تمام مسلمانوں کے مذہبی خیالات کی ساخت میں اب بھی کچھ چیزیں ایسی باقی ہیں جو قدیم جاہلیت کے عقیدوں اور نظریوں سے آئی ہیں، شمالی افریقہ، مصر، شام اور انڈونیشیا کے عام مسلمانوں کے عقائد پر جو مختلف تصنیفات سامنے آئی ہیں وہ اس بیان کا کافی ثبوت مہیا کرتی ہیں، یہاں پر سرٹامس آرنلڈ کی کتاب "ہندوستان میں اسلام" (جو تقریباً تیس سال

پہلے لکھی گئی تھی) کے کچھ غیر مطبوعہ اشارات پیش کرنا کافی ہوگا، اس کتاب کا مصنف ایک عالم تھا اور وہ ہندوستان کے مسلمانوں سے ربط اور واقفیت رکھتا تھا وہ اسلام کے ساتھ جو ہمدردی رکھتا تھا اور اس کے بیان میں جو صداقت ہے اس پر شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے، اگرچہ یہ ممکن ہے کہ اس نے بعض ایسے رواجوں کا تذکرہ کیا ہو جو اب ختم ہو چکے ہیں۔

"اسلامی ہندوستان میں ایسے باقی ماندہ اثرات کی بہتات ہے، اگرچہ با اثر مذہبی رہنما ان کے استیصال کی برابر کوشش کرتے رہتے ہیں، اولاً باقی ماندہ اثرات مقامی رسوم و عبادات کے نقوش ہیں مثلاً کوئی زیارت گاہ جو پہلے تعظیم کی مستحق سمجھی جاتی تھی اب بھی تعظیم کی نظر سے دیکھی جاتی ہے اگرچہ موجودہ مذہب کے پرانے مذہب پر فتح حاصل کر لینے کی وجہ سے اس دیوتا یا دیوی کا نام بدل دیا ہے جس سے اس زیارت گاہ کو نسبت دی جاتی تھی، ہندوستان کے شمال مغرب کے بدھ مندروں کے ساتھ اور بالخصوص کشمیر کے مندروں کے ساتھ یہ صورت پیش آئی ہے۔

لیکن ایسی رسوم کے علاوہ بعض ایسی چیزیں بھی پہلے کی باقی ہیں جہاں ہندو عقیدہ یا ریت کا اصلی کردار چھپانے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی ہے مثال کے طور پر مغربی ہندوستان کے بہت سے محنت پیشہ مسلمان (مثلاً راج مزدور مالی قصائی وغیرہ) ایسے ہیں جو برابر ہندو دیوتاؤں کی زیارت کو جاتے ہیں اور ان سے کھلے بندوں منتیں مانگتے ہیں، وہ مسجد کو بہت کم جاتے ہیں اور ختنے کے سوا کوئی اسلامی شعار شاذونادر ہی اختیار کرتے ہیں، وہ لباس بھی انہی ہندوؤں کا سا پہنتے ہیں جو ان لوگوں کے مسلمان ہونے سے پہلے ان کے ساتھ ایک ہی جاتی میں شامل تھے اور یہ ایک ایسے ملک میں ہوتا ہے جہاں کہ اعتقادات وغیرہ کا فرق عموماً کسی خاص قسم کے لباس کے ہی ذریعہ ظاہر کیا جاتا ہے۔ ان میں سے زیادہ تر ستوائی دیوی پر ایمان رکھتے ہیں جو کسی بچہ کی پیدائش کی چھٹی رات کو اس کی قسمت لکھتی ہے، وہ موبائی دیوی (موت کی ماں) پر بھی یقین رکھتے ہیں اور اس کی عبادت کرتے ہیں تاکہ وہ انہیں ہیضے سے محفوظ رکھے، وہ مہا شوبھا دیوی پر یقین رکھتے ہیں جو باغوں اور کھیتوں کی دیوی سمجھی جاتی ہے، کاشتکار لوگ فصل پر اس کو بکری یا مرغی کی قربانی دیتے ہیں۔

چیچک کی خوفناک دیوی سیتلا کی پوجا تو سارے ہندوستان کے غریب طبقہ میں بہت عام ہے خاص طور پر عورتیں اس کی نام لیوا ہیں اور مشرقی پنجاب کے دیہاتوں میں تو اگر کسی نچلے طبقے کی مسلمان ماں نے سیتلا پر قربانی نہیں چڑھائی ہے تو وہ محسوس کرتی رہے گی کہ اس نے اپنے بچہ کی زندگی کو جان بوجھ کر خطرہ میں ڈالا ہے،

بنگال میں بہت سے مسلمان ایسے ہیں جو سورج دیوتا کی پوجا کرتے ہیں اور ہندوؤں کی طرح اس کو شراب کا چڑھاوا چڑھاتے ہیں اور ایسے مسلمان کسان موجود ہیں جو چاول بونے سے پہلے کھیتوں کے محافظ دیوتا کو چڑھاوا دیتے ہیں۔ بعض اوقات بنگالی ہندو اور مسلمان ایک ہی مندر میں جمع ہو کر ایک ہی طرح کی پوجا کرتے ہیں اگرچہ وہ اپنے معبودوں کو مختلف ناموں سے پکارتے ہیں جیسے کہ ہندوؤں کا سنیہ نارائن۔ مسلمانوں کا سیتہ پیر ہے۔ بنگال کے ایک ضلع سنتھال پرگنہ میں مسلمان لوگ اکثر دیوتا بیدناتھ کے مندر میں مقدس پانی (گنگا جل) لے جاتے نظر آتے ہیں اور چونکہ انہیں مندروں کے اندر جانے کی اجازت نہیں ہوتی وہ اس کو باہر ہی چڑھاوے کے طور پر اوندھا دیتے ہیں بنگالی ہندوؤں کے ایک قومی تہوار "درگا پوجا" میں نچلے طبقے کے مسلمان جتنی بڑی تعداد میں شریک ہوتے ہیں وہ بھی قابلِ ذکر ہے اور کئی مسلمان شعراء نے اس دیوی کے اعزاز میں اور اس کی تعریف میں گیت لکھے ہیں۔

ان توہمات کے باقی رہ جانے میں کچھ ایسے معنی مضمر ہیں جو مغربی یورپ اور شمالی امریکہ میں یا تو بالکل بھلا دیئے گئے ہیں یا جن کی اہمیت اچھی طرح سے ذہن نشین نہیں ہوئی ہے جن لوگوں نے قدرت کے طریقِ عمل کو زیادہ عقلی طور پر سمجھا ہے چاہے وہ اسلام سے تعلق رکھتے ہوں یا اسلام سے باہر ہوں ان کے لئے ان چیزوں سے نفرت و حقارت کرنا تو آسان ہے لیکن صرف نفرت کرنے کا مطلب ہے کہ آدمی ان کے اثرات اور ان کی قوتوں کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ان خیالات و نظریات میں اور بُت پرست عربوں کی جاہلیت میں ایک واضح تعلق ہے ان سے دوچار ہو کر اسلام کا کام آج بھی وہ ہی ہو جاتا ہے جو حضرت محمد صلعم کے وقت میں تھا۔ اس

صورتِ حال میں کوئی بات نئی یا غیر معمولی نہیں ہے بلکہ ان سے پیدا ہونے والے مسائل ایک تازہ شکل میں اور ایک پُر زور طریقہ سے انہیں مسائل کے استمرار اور تسلسل کی دلیل ہیں جو اسلامی مبلغین کو گذشتہ صدیوں میں مسلسل پیش آتے رہے ہیں ۔ یہ تاریخ اور جغرافیہ کے حالات کا جبر تھا کہ اپنی ابتداء سے لے کر اپنی نشوونما اور پختگی کے منازل میں بھی اسلام کو جس طاقت کے خلاف جم کر اور ڈٹ کر مقابلہ میں آنا پڑا ہے وہ جاہلیت کی سادہ عقل دشمنی اور توہم پرستی کے سوا اور کچھ نہ تھی ۔ اس اعتبار سے اسلام کا معاملہ عیسائی مذہب کے برعکس ہے ۔ اس لئے کہ عیسائی مذہب کی مخالفت کے لئے جو طاقت کمربستہ تھی وہ ایک مغرور اور ایک سرکش فرد کے تشکک اور کافری کے شیوے تھے جن کے اندر ذہن وفکر کی بالیدگی اور پختگی کوٹ کوٹ کر بھردی گئی تھی بہر حال ، جن توہمات کا ذکر ہم نے کیا وہ کسی طرح بھی جاہلیت کا واحد یا سب سے خطرناک ترکہ نہیں ہیں یہاں پر اس امر کا جتانا تو فضول ہوگا کہ عقائد کی جاہلی اساس صرف ان ہی لوگوں سے مخصوص نہیں ہے جو اسلام کے پیرو ہیں ۔ وہ خوف وہ عقل دشمنی ، اور تخییل کی وہ کارفرمائیاں جن کا نام جاہلیت ہے ہر تاریخی مذہب کے تحت الشعور میں کام کر رہی ہیں وجہ یہ ہے کہ جاہلیت نوعِ آدم کی اس میراث کا ایک حصّہ ہے جس سے انسان کو کسی حال میں مفر نہیں ۔ تاریخی مذاہب کی پانچ ہزار سال کی زندگی کے ماوراء نوع انسانی کی پانچ لاکھ سال کی زندگی کی جولانیں پڑی ہوئی ہیں وہیں سے انسان کا تحت الشعور ان اثرات کو قبول کرتا ہے جن میں ایک جاہلیت بھی ہے مذہب کا سب سے پہلا اور اہم ترین کام یہ ہے کہ وہ ان باقی ماندہ اثرات کو قابو میں لے آئے اور ان کی اصلاح وتادیب کرے جو ہماری باشعور زندگی کے پس منظر پر محیط ہیں ان اثرات سے انسان کو جو تحریک ملتی ہے وہ مذہب کی ہدایت کے بغیر خودرو اور بے لگام رہتی ہے لیکن مذہب کی ہدایت اور رہنمائی مل جانے پر اس کا رُخ ان مقاصد کی طرف موڑا جا سکتا ہے جن میں خود غرضی اور خود پرستی کی آمیزش ذرا کم ہو چنانچہ مذہب کی تربیت نے اس نامعقول خوف کو جو جاہلی طرزِ عمل کا طرۂ امتیاز ہے احترام اور عقیدت کے ان جذبات میں ڈھالا جا سکتا ہے جو اخلاقیات اور مذہب کے لئے مخصوص ہیں ۔ کوئی مذہب جتنا بلند ہوگا یا اس کی تعلیمات جس حد تک عالم گیر ہوں گی اس حد تک وہ جاہلیت کے اثرات

کی ترجمانی کرنے والی خود غرضی اور حرص و ہوا کے زور کو توڑ کر یا ان چیزوں کو ڈھال کر آفاقی مقاصد و منازل کی طرف لے جائے گا۔

لیکن اس مقصد کے حصول پر مذہب صرف اس وجہ سے قادر ہے کہ خود مذہب کے ڈانڈے بھی تخییل کی زندگی سے ملتے ہیں۔ مذہب نفسانی خواہشوں پر جو پابندی عائد کرتا ہے عقل ان کو صرف تقویت پہنچا سکتی ہے (اور پہنچاتی ہے) لیکن یہ کام عقل کا نہیں ہے وہ خود ان پابندیوں کا نفاذ کرے اور نفسانی خواہشوں کی قلبِ ماہیت کا کام تو ایسی چیز ہے کہ جو عقل کی دسترس سے بالکل باہر ہے۔ اس لئے کہ تخیل کے دائرۂ عمل میں عقل کی فرماں روائی نہیں ہے۔ تجربہ بتاتا ہے کہ جب کبھی عقل نے مکمل اختیار ہاتھ میں لینے کی کوشش کی ہے اور جب تخیل کے افادات مذہبی بصیرتوں کے تابع اور ان سے اثر پذیر ہونے کی بجائے عقل کے شکنجے میں جکڑے گئے ہیں تو ہمیشہ اور انسانوں کے تمام طبقات کی زندگی میں تخیل کی قوتیں تمام بندشوں کو توڑ کر باہر نکل پڑی ہیں۔ اور پھر ان کا اظہار جوش و خروش کے ساتھ اور بے قید و بند طریقے سے ایسے عقائد رسوم کی شکل میں ظاہر ہوا ہے جن کی حق ناشناسیوں کے آگے عقل کی تمام تلقین دھری رہ جاتی ہے۔

کوئی مذہب جو حقیقی طور پر زندہ کہلائے جانے کا مستحق ہے کبھی بھی ان حقائق کو نظر انداز نہیں کرتا اور کبھی اس حقیقت کی طرف سے غافل نہیں ہوتا کہ نفس کی گہرائیوں اور ظلمتوں کے آنے والے اثرات کو منور اور مہذب بنانا اس کا کام ہے۔ عیسائیت نے ہمیشہ "گناہ اولین" کے عقیدے کا اثبات کیا ہے اور اب بھی کرتی ہے، اسلام اس عقیدے کو اپنی تعلیمات میں شامل کرنے سے انکار کرتا ہے پھر بھی "نفس امارہ" کا تصور یا بے قید و بند نفسانی شہوتوں کا نظریہ اسلام کی مذہبی اور اخلاقی تعلیمات میں جاری و ساری ہے اور چونکہ اپنے وجود میں آنے کے بعد سے آج اسلام سادہ یا بسیط جاہلیت سے کش مکش میں مبتلا رہا ہے لہٰذا اس کشمکش کے تعطل نے مستقل طور پر اس کی مذہبی زندگی اور افکار کی گردش کو ان جہتوں میں موڑ دیا ہے جو بعض اوقات تو عیسائیت سے بہت زیادہ مختلف ہو جاتی ہیں، اسی کے ساتھ ساتھ اس کشمکش کے اثر سے اور ان لوگوں کو اپنے اندر جذب کر لینے کی وجہ سے

جو مسلسل جاہلیت کو چھوڑ کر اسلام میں داخل ہوتے رہے ہیں اسلام کے اندر ایک عالم غیب کی حقیقت اور قربت کا شدید اور کامل یقین موجود رہا ہے۔

نامعقول خوف اور سفلی قسم کی خود غرضیوں اور مادہ پرستوں سے آزاد ہو کر جب تخیل کی قوتوں نے اپنے آپ کو اس روحانی تربیت کا مطیع بنایا جو اسلام کی مذہبی تعلیم کا جوہر ہے تو انہی تخیلی قوتوں کو عالم اسلام میں کشف و وجدان کے نئے اور لاثانی مدارج بھی نصیب ہوئے اور یہ چیز صرف تخیل کی ترقی سے عبارت نہیں تھی، بلکہ جو کشف و وجدان کے ذریعے سے حاصل کئے ہوئے عرفان کو حقایق اشیاء کے علم اور ادراک میں سمودینے کی کوشش کی گئی تو تخیل کی اسی بار آوری نے ذہنی قوتوں کے لئے بھی اس طرح (یعنی بر سبیل توازن اور مساوات) ترقی پانے اور وہ نشو و نما حاصل کرنے کا کام بھی آسان بنا دیا۔

تفسیر مظہری اردو

تالیف حضرت قاضی محمد ثناء اللہ حنفی پانی پتی رح

حضرت قاضی صاحب کی یہ عظیم الشان تفسیر مختلف خصوصیتوں کے اعتبار سے بہترین تفسیر سمجھی گئی ہے کلام اللہ کے مطالب و مباحث کی تفہیم و تسہیل، آیات و احادیث کی روشنی میں احکام شرعی کی تشریح و تفصیل اور نکات و حکم وغیرہ کے بیان کے لحاظ سے یہ تفسیر اپنا جواب نہیں رکھتی" ندوۃ المصنفین" کو بجا طور پر یہ فخر ہے کہ اسکے ذریعہ سے اس لاثانی تفسیر کا عربی نسخہ پہلی مرتبہ زیور طبع سے آراستہ ہوا اب اس گوہر نایاب کو اردو کے قالب میں پیش کرنے کا بیڑا اٹھایا گیا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ابتک متعدد جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ اور انشاء اللہ یہ سلسلہ ترجمہ مکمل ہونے تک برابر قائم رہیگا۔

ترجمے کے ساتھ حسب ضرورت تفسیری نوٹ بھی دئے گئے ہیں۔ جن سے مطالب قرآن کریم کے سمجھنے میں مزید آسانی ہوگی ترجمہ نہایت آسان اور شستہ و شگفتہ ہے کتابت و طباعت میں ندوۃ المصنفین کی خصوصیات کا اور بھی زیادہ لحاظ رکھا گیا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مترجم مولانا سید عبد الدائم صاحب جلالی۔

۵ نئے پیسے، مجلد چرمی بارہ روپے ۔ ۵ نئے پیسے [مکتبہ برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی] ہدیہ جلد دوم غیر مجلد گیارہ روپے مجلد چرمی

قسط چہارم:۔

گلہائے رنگا رنگ

بدیعی نسخہ کی ٹائپ کی بے شمار غلطیاں

حضرت تبسم کی بتائی نمونہ کی ایک غلطی

(۶)

مولانا مہر محمد خاں شہاب مالیر کوٹلوی

اوپر کے صفحات میں ہم جناب تبسم کی رہبری میں فیہ ما فیہ کے ہندی وایرانی نسخوں کے پانچ علمی اختلاف دیکھ آئے ہیں۔ اب ذیل میں اسی سلسلہ میں ایرانی بدیعی نسخہ کے ٹائپ کی غلطیوں کے بارے میں بھی فاضل تبسم کا ارشاد ملاحظہ فرمائیے ارشاد ہے کہ:۔

"فیہ ما فیہ" کا ایرانی (بدیعی) ایڈیشن جو ٹائپ سے چھپا ہے، ٹائپ کی بے شمار غلطیوں سے بھرا پڑا ہے۔ یہ غلطیاں کسی صورت میں سو سوا سو سے کم نہیں۔ نمونہ کے طور پر اس میں سے صرف ایک فقرہ نقل کیا جاتا ہے۔ جو ٹائپ سے یوں چھپا ہے:۔

" ابن عطا گوید انبیاء و اولیاء را علیہم السلام بگناہ مبتلا کرد "

(ایرانی ایڈیشن صفحہ ۳۸۳) (دیکھو پیش لفظ ملفوظات رومی ص۱۵)

فاضل مترجم نے ٹائپ کی غلطی ظاہر کرنے کے لئے یہ فقرہ نقل تو فرما دیا۔ مگر یہ ارشاد نہیں فرمایا کہ اس فقرہ میں کیا اور کہاں اور کیسی غلطی واقع ہو گئی ہے، بس بے تکلفی سے اتنا فرما دیا کہ کتاب کی بے شمار طباعت کی غلطیوں کا ایک نمونہ یہ ہے۔

لیکن قبل اس کے کہ اس عبارت کی صحت وسقم پر غور کیا جائے۔ ایک بات کی تصریح ضروری ہے، کہ